© rasailojaraid.com

"ہر خیالے کہ رسید و اہلِ سخن فہم نشد" "در شبستانِ سخن خواب فراموش من است"

غالب پر ایک عمومی نظر

ذرہ مقدار یم اما پر بود نہ صدف از گوہرِ یکتائے ما

ہندوستان نے جن اعلیٰ صلاحیت رکھنے والے اشخاص، اربابِ علم و دانش، اور صاحبانِ فکر و نظر کو جنم دیا ہے، ان کی صفِ اوّل میں ہمارا مقبول و پسندیدہ شاعر، مرزا اسد اللہ خاں غالب، نمایاں حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔ مرزا غالب جو اپنے بے تکلف حلقۂ احباب میں، مرزا نوشہ سے موسوم تھے، اُن میں ایک بلند پایہ شاعر کی خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ یہ محض شاعر تھے، شاعر بن کر پیدا ہوئے تھے، اور ان کی کلاہِ فخر کا طرۂ امتیاز شاعری ہی تھا۔ شعر و ادب سے انھوں نے بطورِ خود رشتہ نہیں جوڑا۔ بلکہ عروسِ شاعری نے خود ان پر ڈورے ڈالے اور اپنا گرویدہ بنالیا، جیساکہ خود مرزا صاحب نے اپنے ایک شعر میں بڑے طنطنے کے ساتھ اس کا دعویٰ کیا ہے ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

ورنہ موروثی پیشہ سپہ گری، سلحشوری، اور کشاورزی تھا، جن کی ذیل کے اشعار میں تلمیح پائی جاتی ہے ؎

فن آبائے ما کشاورزی است مرزبان زادۂ سمرقندیم

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

گردشِ ایام سے مجبور، حصولِ روزگار کی خاطر، کبھی ان کے خاندان کو ہل جوتنا اور کبھی تلوار چلانی پڑی، ویسے ان کے مورثِ اعلیٰ کج کلاہانِ ایران و توران کے سرمایۂ تخت و تاج اور وارث افسر و نگیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے ۔ چنانچہ اپنی آبائی تاریخ مزاحیہ انداز میں بڑے لطف کے ساتھ قطعۂ ذیل میں پیش کی ہے ؎

ساقی! چو من پشنگی و افراسیابیم — دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بہ من سپار — زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

غالب کو زندگی میں بہت کم آسودہ حالی نصیب رہی، اکثر تنگی و ترشی میں دن بیتا کئے۔ طبیعت غزنوی پائی تھی، قسمت ایازی لے کر آئے تھے۔ مزاج میں غیرت مندی و خودداری کا داعیہ غالب تھا، لیکن افلاس و تنگ دستی میں اس کا نباہ سخت دشوار ہوتا ہے ؎

از گرسنگی قوتِ پرہیز نماند — افلاس عنان از کفِ تقویٰ بستاند

ایک مکتوب میں امیر اللہ سرور کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں، از حالِ من پرسیدہ اید، چہ گویم کہ بگفتن نیرزد، چنانکہ گفتہ اند ؎

شکستہ دل تر ازاں ساغرِ بلورینم — کہ در میانۂ خارا کنی ز دور جدا

بعض اوقات زندگی کے ناگزیر تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی افتادِ طبع کے خلاف بصد ناگواری عمل پیرا ہونا پڑا ورنہ ان کا مایۂ خمیر استغنا و بے نیازی ہی تھا، معشوق سے بے اعتنائی تک انہیں گوارا نہ تھی ؎

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

ان کی حساس و غیور طبیعت اس خصوص میں خدا تک سے بھی شوخیاں کرنے سے باز نہیں رہتی ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئیں، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

غالب بھی ایک انسان تھے، فطری اقتضاآت سے مجبور، اور بہ حیثیت شاعر غایت درجہ ذکی الحس۔ انسانی طبیعت منطقی سانچوں میں ڈھلی ہوئی نہیں ہوتی۔ قریب قریب ہر دل متضاد محرکات کا جولانگاہ ہوتا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں گوناگوں حالات سے گذرتا ہے، اور ہر حالت اپنے نقوش و تاثرات قلب پر مرتسم کر جاتی ہے۔ ایسے ہی وارداتِ قلبی کا بلا کم و کاست بے ساختگی کے ساتھ اظہار، شعر و ادب کی جان ہوتا ہے۔ افکار کی بلندی جس طرح شعر گوئی پر اکساتی ہے، ویسے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہی خیالات کی پستی بھی فکر سخن کے وقت دل میں چٹکیاں لیتی اور من کی موج بن کر ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہے۔ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا ۔ ؎

زیک منبع دریں جا مختلف فوارہ می جوشد
مزاجِ حرص قاروں، زہد ابراہیم ادھم ہم
ابین (شاہ ولی اللہؒ)

ایسے فطری شاعر کے ہاں توافق و تسلسلِ افکار کی ٹوہ میں سر مارنا لاحاصل ہے۔ اس کے پاس مست کر دینے والی بادۂ وحدت بھی ہے، ہوس پرستی کی عاشقی بھی۔ اور ادنیٰ آرزوؤں کا طوفان بھی۔ یہ بحرِ افکار میں غوطہ زن ہو کر معانی اور مطالب کے لآلی آبدار بھی برآمد کرتا ہے، اور ساتھ ہی پست جذبات کے خزف ریزوں کو اسی ایک لڑی میں پروتا رہتا ہے۔ اس کے ہاں تمناؤں کی یک رنگی کے بجائے متضاد کیفیات کی بوقلمونی جلوہ طراز نظر آئیگی۔ صہبائے حقیقت کے مجاز کی تلچھٹ، غمِ عشق کے ساتھ غمِ روزگار، عبادت برش کے ساتھ حاصل کا افسوس، ارمانوں کے نکلنے پر بھی کمی کی شکایت، طوفان زندگی میں جینے کے ہاتوں بہتے، کسی کے رخ افروختہ سے داغ دل فروزاں کئے ہوئے آغوشِ لحد میں جذبات کے حسین امتزاج کے ساتھ جا کر دم لیتا ہے ؎

بردم بہ لحد زاں رخ افروختہ داغے
حاجت نبود تربت ما را بہ چراغے

یہ ساری کی ساری عشق خانہ برانداز کی فتنہ سامانیاں ہیں، مجاز ہو کہ حقیقت، دونوں چولی دامن کی طرح ہم رشتہ، قدمے فاصلہ دارد کے مثل دست در کمر رسیدہ ؎

جب اصل اس مجاز و حقیقت کی ایک ہے
پھر کیوں پھرا رہے ہو، ادھر سے اُدھر مجھے
(اصغر)

غالب اپنی زندگی میں کشتۂ ناقدریٔ ایام رہا۔ مرنے کے بعد اس کی تلافی مبالغہ آمیز قدردانیوں سے کی گئی۔ انتہا یہ کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے، محاسنِ کلام غالب، میں اس کے دیوان کو صحیفہ آسمانی، اور ہندوستان کی الہامی کتابوں میں، وید و پران، کے مماثل قرار دیا۔ بعد کے عقیدت مندوں نے اس کے کلام ریختہ کی ہر سطر کی، مثل ایک آیت شرح و تفسیر کی۔ مہملات کی بھی کھود کھود کر، بمصداق کوہ کندن و کاہ برآوردن، خوب خوب دادِ جگر کاوی دی گئی۔ رگِ گل سے بلبل کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر باندھے گئے، اور نرگس کو باغ میں جانے سے اس اندیشہ کے تحت روکا گیا کہ پروانے کا ناحق خون نہ ہونے پائے۔ غالب کے کلام پر اکثر و بیشتر شرحوں میں اسی نوع کا رطب و یابس جمع کر دیا گیا ہے لیکن خود شاعر ایسے سخن ناشناسوں کی تعریف و تحسین سے بے نیاز، خیالات میں مگن اور نچنت اونچے سروں میں یہ راگ الاپ رہا ہے ؎

اے آنکہ خوب ما نشناسی ز زشت ما　　از رد و ہم قبول تو فارغ نشستہ ایم

”مریدان می پرانند“ کا قصہ، پیری، مریدی ہی کا خزینہ نہیں بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کی کار فرمائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پیر کو الوہیت و نبوت کا درجہ عطا کرنا، شاعر کو شجر طوبیٰ کی شاخوں پر زمزمہ سنج و دونفس پرواز دکھلانا، محبوب کی صورت کو مہر و ماہ سے تشبیہ دینا، معشوق کے روندنے سے سبزہ کا نہال ہونا اور توڑنے سے کلیوں کا شگفتہ ہونا یہ سب عشاق ہی کی خیال آفرینیاں اور کارستانیاں ہیں۔ حسن کی جلوہ گاہ کے ہر منظر میں عاشق کی رعنائی خیال گلکار رہتی ہے ؎

حسن کے ہر جمال میں پنہاں　　میری رعنائی خیال بھی ہے (جگر)

اگر ہر شاہد کو حالی اور باسول (BOSWEL) ملا کریں، تو آسمانِ علم پر کئی نئے چاند تارے گمنامی کی بدلیوں میں منہ چھپاتے ہوئے نکلے، افقِ شہرت پر طلوع ہو کر اپنی ضوفشانیوں سے نگاہوں کو چکا چوند کرنے لگیں۔ نواب مرزا خاں داغ نے سچ کہا ہے ؎

نہیں کھلتا کہ کہاں تھی یہ وضع اور ترکیب　　ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

اس جذب و انجذاب کا متلازم اثر معشوق پر یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی اگر نازنین نہیں تو نازآفرین ضرور بن جاتا ہے ؎

گردل از غرض تمنا بمرادے نرسید　　این قدر شد کہ ترا بر سر ناز آوردم

معانی و مطالب شعر کہتے وقت خود شاعر کے بھی ذہن و دماغ میں نہیں ہوتے، بعد میں اس کے کلام پر غور و فکر کرنے والے چار چاند لگاتے اور آب و رنگ پیدا کرتے ہیں۔ ابو نواس خلیفہ ہارون رشید کے دور کا مشہور عربی گو شاعر گزرا ہے۔ اس کے درج ذیل شعر کی کسی مکتب میں توضیح و تشریح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی جا رہی تھی ؎

الا فاسقنی خمراً و قل لی ھی الخمر ولا تسقنی سراً اذا امکن الجھر

(شراب پلاتا جا اور حتی الامکان بلند آہنگی سے مجھے یہ کہتا بھی جا کہ یہ شراب ہے، یہ شراب ہے)

طلباء میں سے ایک نے استاد سے دریافت کیا کہ جب شراب پلائی جا رہی ہے، اور پینے والا ساغرِ بلوریں میں اس بادۂ گلرنگ کو چھلکتا دیکھ رہا ہے تو پھر اس کے کہنے کی کیا ضرورت ہے، کہ کہا جائے کہ یہ شراب ہے! یہ شراب ہے! استاد سے اس کا کوئی تشفی بخش جواب نہ بن پڑا ایک دوسرا طالب علم اجازت چاہ کر یوں وقفِ وضاحت ہوا کہ بہ وقت میگساری جملہ حواس، باصرہ، شامہ، لامسہ اور ذائقہ لذت اندوز ہو رہے ہیں، صرف سامعہ محروم ہے، اس لئے شاعر نے وہاں اس کی بھی رعایت ملحوظ رکھی ہے، تاکہ ہر حاسہ لذت یاب ہوتا رہے۔ اتفاق سے ابونواس ادھر سے گزر رہا تھا۔ کانوں میں اپنے شعر کی بھنک پہنچی، یہ کہتا ہوا کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد" ٹھٹک کر رہ گیا۔ جب طالب علم سے اس مضمون آفرینی کے ساتھ تشریح سنی تو اپنے سینہ سے لپٹا لیا اور پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ واللہ یہ معانی شعر کہتے وقت میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھے۔ میرا ذہن تو اس وقت "خمر و جہر" کو تول رہا تھا۔ اور قافیہ پیمائی و تک بندی میں لگا ہوا تھا۔ یہی حال شعر کہتے وقت اکثر و بیشتر شعراء کا ہوتا ہے۔ شارحین اپنے اوقاتِ فرصت میں آرام کرسی پر دراز، ان پر سر دھنتے اور فکر و نظر کی جولانیاں دکھلاتے ہیں۔ اگر شاعر ان جزئیات پر غور و خوض کرتا رہیگا، تو شعر آورد کی نذر ہو کر اپنی شعریت، بے ساختگی، آمد اور روانی ختم کردے گا اور روحِ شاعری قفسِ اوزان و قوافی سے پرواز کر جائے گی۔ جو فطری شاعر ہوتے ہیں ان کی نظر ان چیزوں پر نہیں جاتی۔ غالب کی آغوش سے جو کوثر ابلتا ہے وہ آبشارِ نطق کی صورت میں لب خاموش سے بہنے لگتا ہے اور صفحہ قرطاس پر موتی بکھیر جاتا ہے۔ مولوی معنوی القاتِ شعر کے اس وجدانی کیف و سرور کو یوں برانگندہ نقاب فرماتے ہیں ؎

من ندانم فاعلاتن فاعلات شعر می گویم بہ از آبِ حیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قافیہ اندیشم و دلدار من گویدش مندیش جز دیدار من

ادب و احترام میں جب غلو ہوتا ہے تو بے ادبی ہونے لگتی ہے۔ تعریف اپنے حد سے تجاوز کر جائے تو تنقیص کا روپ دھارتی ہے۔ سچی تعریف وہی ہے جو حقائق پر مبنی ہو۔ نازیبا تحسین شال میں لپٹی ہوئی تہجین ہوتی ہے ....

"Praise undeserved in scandal in disguise"

اس حقیقت کا اظہار ڈاکٹر سید عبداللطیف نے آج سے چالیس سال قبل اپنی ایک انگریزی تالیف غالب، میں کیا تھا۔ شیدائیان غالب کو اس قسم کا اظہار پسند نہیں آیا۔ سستی شہرت اور علمی فاقت پر اسے محمول کیا گیا۔ تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد آج بھی وہی صورت اس انداز سے موجود ہے۔ نہ کلام غالب میں اس طویل مدت میں کوئی تغیر واقع ہوا ہے، اور نہ فکری رجحانات میں کسی نوع سے تبدیلی۔ احکام، حالات کے تابع ہوتے ہیں، لہذا فیصلہ، الآن کما کان، باقی و برقرار ہے

حضرت علیؑ کی کسی شخص نے رو در رو منافقانہ تعریف کی، آپ نے ارشاد فرمایا، میرے بارے میں جو کچھ تیری زبان پر ہے، اس سے میں بدرجہا کمتر ہوں، لیکن جو کچھ تو اپنے دل کے گوشوں میں چھپائے ہوئے ہے اس سے ہر گونہ بہتر ہوں۔

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے وہی فطرت اسداللہی، وہی مرحبی و عنتری

غالب کی عبقریت اور نابغیت سے انکار نہیں، وہ یقیناً دنیا کے بڑے شاعروں میں سے ایک ہے جس طرح ہر شاعر کے کلام میں بلندی اور پستی پائی جاتی ہے، ویسے ہی اس کا کلام بھی ہے۔ تجلی واستتار انسانیت کے احوال ہیں۔ کبھی وہ طارم اعلیٰ پر مسند نشین نظر آتا ہے، اور کبھی پشت پا پر بھی اپنا پتہ نہیں پاتا، اور خود کو ڈھونڈنے لگتا ہے۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

شاعر میں تو یہ تغیر احوال اور تلون واکردہ فنا ہوتا ہے۔ اس کی حالت اس جگنو کی سی ہوتی ہے جس کو رات کی تاریکی چمکاتی اور اس کے پروبال میں دھوپ چھاؤں کھیلتی رہتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو خود بھی بلند پایہ شاعر تھے، اس صورتِ حال کی کس پوست کندہ انداز میں نقش آرائی کی ہے۔ ؎

کرم شب تاب است شاعر در شبستان وجود　　در پر و بالش فروغے گاہ ہست وگاہ نیست

قدرت کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ غالب اپنے جس کلام کو "بے رنگ" اور "پر از زنگ" سمجھتے تھے وہی اُن کی شہرت اور نام آوری کا باعث بن رہا ہے۔ اپنے اردو اور فارسی کلام کا موازنہ کرتے ہوئے ایک قطعہ میں ذوق کو اس طرح مخاطب کیا ہے، جس کے دو مشہور شعر یہاں پیش کئے جاتے ہیں

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ من است

راست میگویم من داز راست سر نتواں کشید　　آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

یہ سنکر حیرت ہوگی کہ جب ان کا کلام ریختہ شائع ہوا، تو صاحب مطبع نے صرف ایک نسخہ بطور حقِ تصنیف صلہ میں دیا اور مرزا جی کو بجز قبول کوئی صورت بن نہ پڑی۔ لیکن پچاس سال کے بعد یہی ان کا کلام مصوّر ہوکر مرقع چغتائی کی صورت میں منصۂ شہود پر آیا تو اس کے نسخے سو سو روپیہ تک فروخت ہوئے۔ تقریباً ایسی ہی صورت حال سے فٹز جیرالڈ FITZ GERALD کا ترجمۂ رباعیات عمر خیام دوچار ہوا۔ اس ترجمہ کے اشاعت پذیر ہونے کے بعد عرصہ تک اس کا کوئی خریدار فراہم نہ ہو سکا۔ آخر مایوس ہوکر اس نے یہ سارا طومار ردّی کی صورت میں فروخت کر ڈالا۔ کچھ مدت بعد ایک مصوّر کے ہاتھ اس کا ایک نسخہ لگا۔ اس نے رباعیات کا ایک دلآویز مرقع تیار کرکے کتابی صورت میں پیش کیا، عالمگیر شہرت ہوئی اور تھوڑے عرصہ میں سیکڑوں ایڈیشن نکل گئے۔ شکسپیر کو زندگی میں ایک ایکٹر سے زیادہ وقعت نصیب نہیں ہوئی۔ یونان کا مشہور رزمیہ گو شاعر، ہومر، خود اپنے شہر میں مدۃ العمر ہرزہ گرد اور دریوزہ گر رہا۔ اکثر بڑے شاعر مرنے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں ؎

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد　　چشم خود بربست و چشم ما کشاد
(اقبال)

عوام کالانعام کی حالت یہ ہے کہ سامری کے بچھڑے کو الوہیت کا درجہ دیں گے اور نور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نبی کو نو سو سال کی تبلیغ وارشاد کے بعد بھی پیغمبر تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہیں گے۔ حکیم سنائی نے سہل و ممتنع انداز میں کس گہری صداقت کا اظہار کیا ہے ؎

گاؤ را دارند باور درخدائی عامیاں　　　نوح را باور نہ کردند از پئے پیغمبری

سچ ہے قبول خاطر اور لطف سخن خداداد ہے۔ مولانا جامی نے کس قدر حقیقت میں ڈوب کر یہ اشعار کہے ہیں۔ ؎

قبول خاطر اندر دست کس نیست　　　بہ مقبولی کسے را دسترس نیست

بسا لولی وش شیریں کرشمہ　　　کہ زہر دخوں زدہا چشمہ چشمہ

بسا شیریں رخ شکر شمائل　　　بسویش طبع مردم نیست مائل

مرزا نے اپنے کلام کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ مرنے کے بعد وہ شہرت پائے گا۔ یقیناً یہ ان کا فارسی کلام تھا، ریختہ کا نہیں ؎

تازدیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن　　　ایں مے از قحط خریداراں کہن خواہد شدن

کوکبم را در عدم اوج قبولے بودہ است　　　شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

یہ کہنا سخت دشوار ہے کہ غالب کا اپنا کوئی فلسفہ بھی تھا، ہاں جو فلسفیانہ افکار و خیالات رائج تھے، انھیں شعر و سخن کا پیرایہ بخشا گیا۔ ان سب میں نمایاں توحید وجودی کا نظریہ ہے۔ بڑے کھل کر، سنور سنور کر، رنگا رنگ انداز میں اسے پیش کرتے ہیں، لیکن تصویر پھر بھی ادھوری ہی رہ جاتی ہے ؎

تلم بوقلموں درکف اندیشہ گداختت　　　رنگ آخر شد و نیرنگ تو تصویر نشد

حالی رقم طراز ہیں: "مرزا اسلام کی حقانیت پر سخت یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے، مگر جیسا کہ کہا گیا ہے، من احب شیئاً اکثر ذکرہ، توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اصناف سخن میں بیان کیا ہے، غالباً،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے نہیں کہا۔ مرزا کے حق میں اگر اور کچھ نہیں تو عرفی کا یہ شعر ضرور صادق آتا ہے ؂

امید ہست کہ بیگانگیٔ عرفی را   بہ دوستی سخن ہائے آشنا بخشند

انھوں نے تمام عبادات، واجبات اور فرائض میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی، اور دوسرے نبیؐ اور اہل بیت نبیؐ کی محبت، اور اسی کو وہ وسیلۂ نجات سمجھتے تھے" ذیل کے شعر میں اگر "مظہر" کے بجائے "غالب" تخلص کردیا جائے تو حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کا یہ شعر گویا انکے معتقدات کی ترجمانی کررہا ہے ؂

نہ کرد مظہر ما طاعتے و رفت بخاک   نجات خود بتولائے بوترابؑ گذاشت

غالب کو اپنے کلام پر بڑا ناز تھا۔ وہ ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں حضرت امیر خسروؒ کے سوا کسی کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں، اہلِ ہند میں سوائے خسروؒ دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ وہ خود کو ایرانی شعراء ۔ عرفی۔ نظیری۔ طالب۔ کلیم، صائب وحزیں۔ کے ہم پلہ سمجھتے تھے ؂

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی   مباش منکر غالب کہ در زمانۂ تست

مرزا نے اپنی کتاب، مہر نیمروز، میں ایک موقع پر بہادر شاہ ظفر سے خطاب کرکے یہ ظاہر کیا ہے کہ شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر متعدد مرتبہ سیم وزر سے تولا گیا، مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک مرتبہ کلیم کے کلام سے تول لیا جائے۔ ایک مرتبہ سلطان جی اور امیر خسروؒ کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا۔ مرزا نے فی البدیہہ یہ شعر انشا کرکے پڑھا۔

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب   نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

مرزا کو خود اس کا افسوس ہے کہ اپنائے روزگار نے ان کے ادبی کارناموں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ان میں جو جو خوبیاں اور کمالات ہیں ان سے کماحقہ بہرہ یاب اور شناسائی حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ کر سکے۔ اس نظم و نثر کو جس حسن و خوبی کے ساتھ سنوارا اور نرد وبس نظر بنایا گیا ہے، ان سے بہ اعراض و سرگرانی کے ساتھ گزر گئے:-

"حیف کہ ابنائے روزگار، حسن گفتار مرا نشناختند، مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند، و ازیں نمایش ہائے نظر فروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام، سرگراں گذشتند"

اس محل پر غالب کے فارسی کلام سے چند ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اپنی ندرت فکر، جدّت تخیل اور بدیع الاسلوبی میں منفرد ہیں اور جن پر اصحاب نظر، صیرفیان سخن کی نگاہیں اب تک نہیں پڑی ہیں۔

از وہم قطرگیست کہ در خود گمیم ما — اما چو وارسیم ہماں قلزمیم ما
ودیعت بودہ است اندر نہاد عجز ما نازے — جدا از قطرہ نتواں کرد طوفان دستگاہی را
تا تنک مایہ بہ دریوزہ خود آرا نشود — نرخ پیرایۂ گفتار گراں می بایست
مستی انداز لغزشے دارد! — حیف پائے کہ آفتش ز سراست
در جستن مانند تو لنگرۂ زبون است — در زادن ہمتائے من اندیشہ عقیم است
گر خود بغلامی پذیرند گدا باش — بر در بزن آں حلقہ کہ در گوشش نکردند
ہائے پرکاری ساقی کہ بہ ارباب نظر — مے بہ اندازہ و پیمانہ بہ انداز دہد
ادب آموز بیش در پردۂ محراب می بینم — نخست از جانب حق بودہ انداز خمیدن ہم
دور افتادم ز یار ماہی بے دجلہ ام — نیست دم در کنار و دجلۂ بے ماہیم
دستگاہ گلفشانیہائے رحمت دیدہ ام — خندہ بر بے برگی توفیق طاعت می کنم
زمانہ خاک مرا در نظر نمی آرد — ز نقش پائے تو نازش سرفراز میخواہم
گل چہ ماند بہ گردے بہ ردش بازار سرد — بہر تجدید طرب طرح خزاں انداختہ

مرزا کی طبیعت میں ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، حالات کیسے ہی ناساز گار ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر ان کی شگفتہ مزاجی و خوش طبعی ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑتی تھی۔ بقول مولانا حالی اگر انھیں بجائے حیوانِ ناطق کے حیوانِ ظریف و ضاحک کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بات بات میں بذلہ سنجی، مذاق، دل لگی ان کے کام و دہن ہمیشہ چومتی رہتی تھی۔ مرزا صاحب کی بذلہ سنجی کی ایک دلچسپ مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔ لکھنؤ کی ایک صحبت میں جب کہ مرزا وہاں موجود تھے۔ ایک روز لکھنؤ اور دلی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا سے کہا کہ جس موقع پر اہل دہلی "اپنے تئیں" بولتے ہیں۔ آپ کی رائے میں فصیح "آپ کو" ہے یا "اپنے تئیں"؟ مرزا صاحب نے کہا فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو آپ بولتے ہیں، مگر اس میں دقت یہ ہے کہ مثلاً آپ میری نسبت یہ فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل جانتا ہوں، اور میں اس کے جواب میں اپنی نسبت یہ عرض کروں کہ میں تو آپ کو کتے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں، تو سخت مشکل واقع ہوگی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا، اور آپ ممکن ہے اپنی نسبت سمجھ جائیں۔ سب حاضرین یہ لطیفہ سن کر پھڑک گئے۔ وہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں۔ ؎

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

نواب مرزا خاں داغ نے شاید مرزا ہی کو دیکھ کر یہ شعر کہا ہوگا ؎

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

مولانا حالی نے اپنے استاذ کے مرثیہ میں اس خصوصیت کو واشگاف پیش کیا ہے ؎

شیخ اور بذلہ سنج و شوخ مزاج
رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

قرآن حکیم نے جو نقشہ شعراء کا کھینچا ہے، اس سے صحیح تر تصویر اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

الشعراء یتبعھم الغاوٗن ہ الم تر انھم فی کل واد یھیمون ہ وانھم یقولون ما لا یفعلون ہ شعراء کی متابعت کرنے والے آوارہ خرامی اور بے راہ روی کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ ہر وادی میں ہرزہ

© rasailojaraid.com

گردی کرتے ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں، جہد و عمل سے بیگانہ ہستی کردار سے عاری، اور گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مرزا غالب ایک عظیم المرتبت انسان تھے۔ قلم کے دھنی، نظم و نثر پر کامل دستگاہ رکھنے والے، بلند تخیل، فکر رسا، ہمہ گیر ذہن و دماغ کے حامل تھے۔ شعر و سخن ان کا خاص فن تھا جس میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا جن فطری کوتاہیوں کے ساتھ انسان کی خلقت ہوئی ہے، وہ ان میں بھی دوسروں کی طرح موجود تھیں۔ انسان کی بڑی عظمت یہی ہے کہ اس کی خوبیوں اور کمالات کا پلہ بھاری رہے۔ اس میں وہ دوسروں سے سر برآوردہ تھے اور یہی ان کی بڑائی کی ناقابلِ انکار دلیل ہے ؎

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست درید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

علامہ اقبال نے حرف و صوت کے پردوں میں جن تاثرات کا اپنی نظم، غالبؔ میں اظہار کیا ہے، فی الجملہ اس سے بہتر ہمارے جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی۔ ہم اسی کو اپنے مقالہ کا... اختتام بناتے ہیں

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نغموں سے سکونِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
اے جہان آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرہ ذرہ میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟ تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین